سید محمد محسن

سید محمد محسن کا شمار اردو کے اہم افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے، وہ نفسیات کے پروفیسر تھے اور نفسیات ان کا خاص موضوع تھا۔ ان کے افسانوں کا ایک مجموعہ 'انوکھی مسکراہٹ' اردو دنیا میں کافی مقبول و معروف ہوا۔ اس مجموعے کی بیشتر کہانیاں نفسیاتی نوعیت کی ہیں۔ خاص طور پر 'انوکھی مسکراہٹ' ڈاکٹر محمد محسن کی ایک ایسی کہانی ہے جس کے ذکر کے بغیر اردو افسانے کی تاریخ شاید مکمل نہیں ہو سکتی ہے۔

ڈاکٹر محمد محسن کی پیدائش 10/جولائی 1910ء کو پٹنہ میں ہوئی۔ ان کے والد کا نام سید محمد رشید تھا۔ محسن صاحب نے 1926ء میں رام موہن رائے سمینری پٹنہ سے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ 1928ء میں پٹنہ کالج سے آئی اے، 1931ء میں نفسیات کے ساتھ بی اے آنرس کا امتحان پاس کیا اور 1934ء میں نفسیات میں ہی پٹنہ یونی ورسٹی سے ایم اے فرسٹ کلاس سے پاس کیا اور گولڈ میڈل حاصل کیا۔ 1938ء میں وہ پٹنہ کالج میں شعبہ فلسفہ میں عارضی طور پر لکچرر بحال ہوئے پھر 1948ء میں پٹنہ یونی ورسٹی کے شعبہ نفسیات میں مستقل طور پر لکچرر بحال ہوئے۔ 1953ء میں وہ شعبہ نفسیات میں صدر شعبہ نفسیات مقرر ہوئے اور 1974ء میں وہ اپنی ملازمت سے سبکدوش ہو گئے۔

ان کی کتابوں میں 'انوکھی مسکراہٹ' افسانوں کا مجموعہ 'نفسیاتی زاویے' نفسیاتی مضامین کا مجموعہ 'زخم کے پھول' شعری مجموعہ بہت اہم ہیں۔ ان کے علاوہ ان کی دوسری کتابیں بھی شائع ہوئی ہیں۔

سید محمد محسن کو تین بیٹے اور چار بیٹیاں تھیں، آپ نے 1973ء میں اپنی اہلیہ کے ساتھ حج کا فریضہ بھی ادا کیا تھا۔ سید محمد محسن کی وفات 2002ء میں علاج کے دوران دہلی میں ہوئی۔

ABOIEL SOLUTIONS ABSOL PATNA

فرار

'محمود' ماں کی کرخت آواز محمود کے کان میں گونج گئی۔ وہ بازو کے کمرہ میں حساب بنا رہا تھا۔ حساب کی کاپی سمیٹے بغیر اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کا نام خطرہ کی گھنٹی کی طرح اس کے کان میں بج رہا تھا۔ وہ بھاگا ہوا ماں کے پاس آیا۔ اس کی ماں کا فربہ جسم غصہ سے کانپ رہا تھا۔ جیسے تند ہوا میں برگد کا درخت ڈول رہا ہو۔ ماں کی ابھری ہوئی آنکھیں، لال انگارہ سا چہرہ، پھیلی ہوئی گردن دیکھ کر سہم گیا گو یہ منظر اس کے لئے نیا نہیں تھا۔ معصوم فرشتہ کی طرح نظریں نیچی کئے محمود ماں کے روبرو کھڑا ہو گیا۔ یہ منفعلانہ انداز آنے والی آفت کے مقابلہ میں اس کا تنہا ہتھیار تھا۔

'بلا انہیں باہر سے۔' محمود کی ماں نے گرجتے ہوئے کہا۔

'آپ کو بلا رہی ہیں۔' محمود نے رکتے رکتے کہا۔

'مجھ سے کیا کام ہے؟ غصہ میں ہیں تو ہوا کریں، انہیں تو ہر وقت غصہ ہی چڑھا رہتا ہے۔'

'اچھا چلو، آتا ہوں۔' اس کے باپ نے کرسی سے اٹھتے ہوئے کمزور آواز میں کہا۔

محمود کے باپ کو دیکھ کر اس کی ماں اور بلند آواز میں گرجنے لگی۔

'تم نے میری مٹی پلید کر ڈالی۔ نوج اس دن کو جب میرے باپ نے تمہارے ساتھ میری شادی کی۔'

'آخر کچھ کہو گی بھی یا یونہی بکے جاؤ گی؟' محمود کے باپ نے آہستگی سے سوال کیا۔

'ہاں، ہاں! میں تو بکواس مچاتی ہی ہوں۔ پاگل سری سب کچھ ہوں۔'

'ارے بھائی میں کب کو تمہیں پاگل کہہ رہا ہوں۔ اپنے منہ جو چاہو کہہ لو۔'

'ہاں جی تم سا شریف دنیا میں کون ہوگا۔ جانے دو میں رذیل سہی، کمینی سہی۔ لیکن تمہارے گھر میں اب ایک منٹ میرا قدم نہیں جم سکتا۔'

'ارے بھائی خدا کا واسطہ کچھ بتاؤ بھی تو۔'

'اہا، کیسے بھولے ہیں آپ۔ گویا کچھ جانتے ہی نہیں۔ بیٹھے بیٹھے سارا فساد مچاتے رہتے ہیں اور اوپر سے دیکھو تو جیسے موم کی گڑیا۔ میں نے تمہیں ہزار بار منع کیا ہے کہ اس موئے وکیل کے یہاں نہ جایا کرو۔ لیکن تم کہاں ماننے والے اس کی جورو تو ڈائن بن کر مجھے نگلنے کی فکر میں ہے اور تم اس سے گھل مل کر میٹھی میٹھی باتیں کیا کرو۔'

'ارے بھئی، آہستہ بولو۔ محلہ والے سنیں گے تو کیا کہیں گے۔ تمہیں تو خواہ مخواہ شک پیدا ہو جاتا ہے۔'

محمود کی ماں نے اور چیخ چیخ کر بولنا شروع کیا۔ ہزاروں گالیاں وکیل کو دیں۔ سیکڑوں صلواتیں محمود کے باپ کو سنائیں۔

محمود اپنی عمر کے دسویں ہی سال میں یتیم ہو گیا اور باپ کے مرنے کے تھوڑے ہی عرصہ بعد اس کی ماں بھی اسے چھوڑ گئی۔ قسمت نے اسے اس کے عسرت زدہ ماموں کے مکان میں منتقل کر دیا۔ زندگی کی دشواریاں اس کے لئے ایک نامہر لیکن عاقبت اندیش استاد بن گئیں۔ ماحول کی ناسازگاریاں اسے جتنی زیادہ ٹھوکر لگاتیں اس کے اندر استواری اور استقامت کی کوششیں اتنا ہی زیادہ تیز ہوتی جاتیں۔ اس صغرسنی میں بھی وہ مستقل مزاجی اور پختگی عزم کا ایک مکمل نمونہ معلوم ہوتا تھا۔ جیسے اس کا بچپن، طفولیت اور شباب کے درمیانی مراحل پھاند کر انسانی تعمیر کی آخری منزل تک پہونچ گیا ہو۔

محمود یونی ورسٹی کے ہوسٹل میں رہتا تھا جہاں اس کی تنہائی پسندی اور رہبانیت کا اس کے ساتھ برابر مذاق اڑایا کرتے تھے۔ یونی ورسٹی کی فضا کو۔ ایجوکیشن (لڑکے اور لڑکیوں کی یکجا تعلیم) کی وجہ سے گہری رومانی ہو گئی تھی۔

محمود کے ساتھی کمال جادو بیانی اور گرم جوشی کے ساتھ ان فردوسی مناظر کی تصویریں اس کے آگے کھینچتے۔ محمود کی طبیعت میں بھی گدگدی سی پیدا ہو جاتی۔

'یار تمہارے سینہ میں دل نہیں لکڑی کا ٹکڑا ہے جس پر بجلی تک کا اثر نہیں ہوتا۔ کل کلاس میں خالدہ کس طرح نظریں بچا بچا کر تمہیں تک رہی تھی۔ کاش وہ اس طرح مجھے دیکھتی ہوتی۔ یقین مانو میں اپنا کلیجہ نکال کر رکھ دیا ہوتا۔' عظیم نے اپنے خاص پرجوش انداز میں کہا۔

'خیر مذاق وغیرہ ختم کرو بے چاری معصوم لڑکی پر جو تم اس قسم کی تہمت لگاتے ہو۔ یہ تو بہت نامناسب بات ہے۔'

'تہمت کیسی؟ ہم انہیں گھورتے رہتے ہیں اور وہ بے چاریاں ہمیں تکنے سے بھی رہیں۔ اور بھئی تمہیں تو اپنا مول معلوم نہیں۔ کاش میرے اندر تمہاری شکل وصورت ہوتی۔ میری زندگی ایک مستقل رومان ہوتی رومان۔' عظیم نے سینہ تانتے ہوئے کہا۔ 'آج شام کو نمائش آؤ تو تمہیں دکھلادوں کہ یاران نکتہ داں کے لئے کیسی صلائے عام ہے۔'

'میں تمہارے کہنے پر آج شام کو نمائش جاؤں گا۔ پھر وہاں سے کسی ریستوراں میں چلنا۔ لیتے آنا اپنی کسی مہ پارہ کو وہ بھی میری استقامت آزمالے گی۔'

'واقعی چلوگے یا صرف آن میں بول رہے ہو؟' عظیم نے محمود کے چہرہ پر نظریں جماتے ہوئے سوال کیا۔

'محمود کسی دعوے کے بعد قدم پیچھے ہٹانا جانتا ہی نہیں۔' محمود نے فاتحانہ انداز میں جواب دیا۔

عظیم تو محمود سے وعدہ لے کر چلا گیا۔ لیکن محمود ایک عجیب تاثراتی کشاکش میں مبتلا ہوگیا۔ جیسے کوئی کسی گناہ کے ارتکاب کا ارادہ کرکے پچھتانے لگا ہو اور نتائج کے موہوم لیکن ہوش ربا تصورات وکیفیات کے سانچہ میں ڈھل کر اس کی روح میں پیوست ہورہے ہوں۔ محمود کی انگلیاں غیر اضطراری طور پر رہ رہ کر اس کی نبض ٹٹولنے لگتیں جیسے اسے بخار کا احساس ہورہا ہو۔ اس کے دل میں ایک غیر معمولی وحشت ناک دیوانگی کی کیفیت محسوس ہورہی تھی جیسے کوئی رات کے سناٹے میں کھلے میدان سے خوف کھانے لگتا ہو۔ اس غیر معمولی اضمحلال اور سنگی کا کوئی سبب محمود کی سمجھ میں نہ آتا تھا۔

وہ ہاسٹل سے باہر نکلا اور قدم تیز کرتا ہوا نمائش کو روانہ ہوا۔ کافی دور پہونچ چکنے کے بعد اسے احساس ہوا کہ وہ غلط راستہ پر لگ گیا ہے۔ اسے اپنی اس بھول پر حیرت سی ہورہی تھی۔ اس کے پاؤں سرد ہوگئے اور وہ دیر تک اسی جگہ مبہوت کھڑا رہا جیسے اسے سکتہ سا ہوگیا ہو۔ 'اب نمائش جانا بالکل بے سود ہے۔' اس نے کہا۔ 'عظیم انتظار کرکے کہیں اور جاچکا ہوگا۔' وہ اپنے کمرہ کی طرف لوٹ آیا اور کرسی پر بیٹھ کر اپنی اس خودفراموشی کا جائزہ لینے لگا۔ آخر اسے ہوکیا گیا تھا؟ اس کی سمجھ میں کچھ نہ آتا تھا۔

اپنی خود اعتمادی پر یہ کاری ضرب کئی دنوں تک محمود کے دماغ میں الجھنیں پیدا کرتی رہی گو عظیم سے اس نے طبیعت کی خرابی کا عذر پیش کردیا تھا جسے عظیم نے 'بہانہ سازی' کہہ کر ٹال بھی دیا۔

یونی ورسٹی کی تعلیم کے بعد مقابلہ کے امتحان میں شامل ہوا اور اسے ڈپٹی کلکٹری مل گئی۔ نسبتیں اس کی تعلیم کے وقت ہی سے آتی تھیں۔ اب بڑے بڑے گھرانوں سے پیام آنے لگے۔

ایک دن محمود گھر سے واپس آیا تو گھر کی ویرانی اسے کاٹتی ہوئی سی محسوس ہوئی۔ اسے اپنی زندگی حیات کی ایک بے روح نقل نظر آنے لگی۔ گھر کے سناٹے میں دیوار سے لگی ٹک ٹک کرتی ہوئی گھڑی اس کے دماغ پر ٹھوکریں سی مارنے لگی، گھڑی کا پنڈولم اسے اپنی ذات کا مرقع معلوم ہونے لگا۔ ویسا ہی ایک طریقہ اور ایک رنگ پر حرکت کرتا ہوا' وہ کب تک مشین کے پرزوں کی طرح زندگی گزارتا رہے گا۔

اس نے سوچا اور فیصلہ کرلیا کہ وہ بہت جلد شادی کر کے زندگی کی کیف مآبیوں سے ہم کنار ہو کر رہے گا۔ اسی شام کو اس نے اپنی ساری پچھلی نسبتوں پر نئے سرے سے غور کرنا شروع کر دیا۔ اکثر و بیشتر کے متعلق اسے علم تھا کہ وہاں اب اس کے لئے جگہ خالی نہ رہی تھی۔ باقی ماندہ چند نسبتوں میں اسے ایک ہر اعتبار سے قابل اعتنا معلوم ہوئی۔ صرف لڑکی کی تعلیم نامکمل تھی، لیکن لڑکی کا سن زیادہ نہ تھا اس لئے یہ خامی دور کی جاسکتی تھی۔ محمود نے اس نسبت کی ازسرنو چھیڑ چھاڑ کرائی۔ بات پختہ ہوگئی اور عقد بھی جلدی ہوگیا۔ لیکن رخصتی لڑکی کے میٹریکولیشن پاس کرنے تک ملتوی رکھی گئی۔

امتحان کا نتیجہ زبیدہ کی خاطر خواہ کامیابی کا مژدہ لایا۔ محمود خوشی سے دیوانہ ہوگیا۔ اس کے خواب اب حقیقت بننے والے تھے۔ وہ اس خیال کی لذت سے سرشار ہو رہا تھا۔

دوسرے ہی دن سے محمود اپنی شادی کی تیاری میں منہمک ہوگیا۔ اس نے دفتر سے ڈھائی ماہ کی مسلسل فرصت لے لی۔ شادی کے اخراجات پر اس نے کثیر رقم خرچ کی۔ شہر کے سارے معززین کو بارات کی شرکت کی دعوت دی۔

لیکن سسرال میں قدم رکھنے کے بعد اس کے اندر ایک عجیب حیرت انگیز تغیر پیدا ہونے لگا تھا۔ اس کی آنکھیں بے نور اور متوحش سی دکھائی دینے لگی تھیں۔ اس کا جسم برف کی طرح سرد ہوتا جارہا تھا اور چہرہ کی سرخی رفتہ رفتہ پھیکی پڑتی جارہی تھی جیسے کوئی دور سے ایک بھیانک منظر دیکھ رہا ہو۔

باہر کے لوازمات کے بعد جب محمود کو زنانہ مکان کے اندر لے جایا جانے لگا تو اس کے پاؤں میں

لڑکھڑاہٹ پیدا ہوگئی اور اس کے سارے جسم میں ایک ہیبت ناک تھرتھراہٹ، جیسے اسے شدت کا جاڑا لگ رہا ہو۔ آگے قدم بڑھانا اس کے لئے ناممکن ہوگیا۔ عورتوں میں محمود کی اس کیفیت پر ہلچل سی مچ گئی اس کے سسر کو اطلاع دی گئی۔ وہ بھاگا ہوا محمود کے قریب آیا۔ مزاج پرسی کی، طبیعت کا حال دریافت کیا۔ لیکن محمود کو جیسے سانپ سونگھ گیا تھا۔ اس کے منہ سے ایک لفظ نہ نکلا۔ جیسے وہ دفعتاً گونگا ہوگیا یا اس نے ابھی بولنا سیکھا ہی نہ ہو!

لفظ و معنی

کرخت ۔ سخت

فربہ ۔ موٹا

تند ۔ تیز

برگد ۔ بڑ (ایک درخت کا نام)

انگارہ ۔ آگ کا شعلہ، تودہ

روبرو ۔ آمنے سامنے

منفعلانہ ۔ شرمندگی کے ساتھ

مٹی پلید کرنا ۔ عزت برباد کردینا

عسرت زدہ ۔ معاشی تنگی کا شکار

عاقبت اندیش ۔ دور تک نتائج کو دیکھنے والا

نامہر ۔ بے وفا

ناسازگار ۔ ناموافق

استواری ۔ مضبوطی

استقامت ۔ ٹھہراؤ، پختگی

صغرسنی ۔ بچپن کی عمر

عزم ۔ ارادہ

طفولیت - بچپن

شباب - جوانی

رہبانیت - دنیا کو چھوڑ کر زندگی گزارنا

ریستوراں - ہوٹل

کشاکش - کشمکش

موہوم - دھندلا

اضمحلال - کمزوری، تھکاوٹ

آپ نے پڑھا

- اس افسانے میں ایک نوجوان مرد (محمود) کا کردار سامنے آتا ہے جو حصول تعلیم کے لئے سرگرداں رہتا ہے اور عام نوجوانوں کے برخلاف ہوسٹل میں ایک ایسی مثالی زندگی گزارنا چاہتا ہے جو ایک اچھے طالب علم کی پہچان ہوتی ہے لیکن ساتھیوں کے اکسانے پر وہ تفریح کی طرف مائل ہو جاتا ہے لیکن وہ ایک نفسیاتی الجھن کا بہر حال شکار رہتا ہے۔ بچپن میں اپنے گھر میں ماں کی سخت مزاجی، شدت پسندی اور باپ پر بے جا حکمرانی کا منظر نامہ اسے لاشعوری طور پر عورت سے متوحش اور متنفر کر دیتا ہے۔ اس نفسیاتی کیفیت میں حصول تعلیم کے بعد اور اچھی ملازمت میں داخل ہونے کے بعد جب وہ شادی کی پہلی رات سسرال میں زنان خانہ کے اندر داخل ہوتا ہے تو اسے اپنے گھر کا وہ گھٹن بھرا ماحول نظر آنے لگتا ہے جہاں عورت غلط انداز میں مرد کو دباتی اور اس کی تذلیل کرتی ہے۔ اس نفسیاتی نکتے نے اسے ازدواجی فرائض سے خوفزدہ کر دیا اور اس کی شخصیت کو نامکمل بنا دیا۔

مختصر ترین سوالات

1. ڈاکٹر محمد محسن کی پیدائش کس شہر میں ہوئی تھی؟
2. ڈاکٹر محمد محسن کی تاریخ پیدائش بتائیے۔
3. زیر نصاب افسانوں میں ڈاکٹر محمد محسن کا کون سا افسانہ ہے؟
4. ڈاکٹر محمد محسن کے والد کا نام بتائیے۔
5. ڈاکٹر محمد محسن کس موضوع پر مہارت رکھتے تھے۔

مختصر سوالات

1. ڈاکٹر محمد محسن کی تدریسی سرگرمیوں پر پانچ جملے لکھیے۔
2. ڈاکٹر محمد محسن کی تصنیفات کا ذکر کیجیے۔
3. محمود کے کردار پر پانچ جملے لکھیے۔

طویل سوالات

1. ڈاکٹر محمد محسن کی افسانہ نگاری پر ایک مضمون لکھیے۔
2. افسانہ 'فرار' کا مرکزی خیال بیان کیجیے۔

آیئے، کچھ کریں

1. اردو میں نفسیاتی افسانوں کے بارے میں اپنے استاد سے معلومات حاصل کیجیے۔
2. اپنے کلاس میں افسانے کے آغاز وارتقاء پر ایک مذاکرہ کیجیے۔

قمر جہاں

قمر جہاں کی پیدائش تقریباً 52-1951 میں سمستی پور ضلع کے مردم خیز گاؤں بزرگ دوار میں ہوئی۔ اسی گاؤں کو ان کا آبائی وطن سمجھنا چاہئے۔ آپ کے والد کا نام سید عطاء الحق تھا۔ خاندان کے افراد علم و ادب سے دلچسپی رکھتے تھے۔ چنانچہ روایتی تعلیم حاصل کرنے کے بعد قمر جہاں پٹنہ آگئیں اور پٹنہ یونی ورسٹی سے اردو میں ایم۔اے اور پی۔ایچ۔ڈی کیا۔ اردو ادب سے فطری دلچسپی ہونے کی وجہ سے زمانہ طالب علمی میں ہی یعنی 1966ء سے افسانہ لکھنا شروع کر دیا۔ آپ کی پہلی کہانی 'جنون وفا' ہے، جو ماہنامہ 'صبح نو' پٹنہ سے 1966ء میں اشاعت پذیر ہوئی۔

سندر وتی مہیلا کالج، بھاگل پور کے شعبہ اردو سے آپ نے اپنے تدریسی کیریر کا آغاز کیا اور ترقی کر کے بھاگل پور یونی ورسٹی کے صدر شعبہ اردو تک کے عہدہ کو سنبھالا۔ افسانہ نگاری کے علاوہ آپ کے متعدد تنقیدی مضامین کے مجموعے بھی شائع ہو کر منظر عام پر آ چکے ہیں۔ تدریسی خدمات و تصنیفی مصروفیات ایک ساتھ جاری ہیں۔

قمر جہاں کی تصانیف میں تین افسانوی مجموعے ہیں جن میں 'چارہ گر' (1983ء)، اور 'اجنبی چہرے' (1991ء) شائع ہو چکے ہیں۔ اور ایک افسانوی مجموعہ 'یادنگر' زیر اشاعت ہے۔ 'اختر شیرانی کی جنسی و رومانی شاعری'، 'معیار'، 'کلام عبداللہ حافظ مشکی پوری' (تحقیق و تدوین کلام) اور 'حرف آگہی' آپ کی تنقیدی تصانیف ہیں۔ قلمی سفر ابھی جاری ہے۔

کٹی ہوئی شاخ

کتنے سال بعد وہ اپنے وطن واپس آیا تھا۔ ہر چیز نئی نئی اور قدرے اچھوتی اچھوتی سی معلوم ہو رہی تھی۔ ایک مدت تک باہر رہ جانے کے باعث اب وہ خود اپنے وطن کے لئے اجنبی سا ہو گیا تھا مگر اس اجنبی پن میں بھی اپنے پن کا احساس پنہاں تھا۔ وہ دیر سے خود اپنے آپ سے سوال کر رہا ہے۔

کیا وہ سچ میں اجنبی ہو گیا ہے؟ شکل و شباہت، لباس اور کچھ حد تک گفتگو میں وہ بدل گیا ہے۔ لیکن اس کا باطن.....؟ اندرون میں ایک عجب توڑ پھوڑ مچی ہوئی ہے، آخر وہ اپنے آپ کو اتنا بے بس کیوں محسوس کر رہا ہے؟

بار بار اس کا ذہن کسی ایک سوال کے گرد مکڑی کے جالے کی طرح گھوم رہا ہے۔

'آخر وہ اتنی اچھی سرزمین اور ایسے دلدار لوگوں کو چھوڑ کر کیوں اتنے لمبے عرصے تک.....؟ کیا اب سچ میں اس کی حیثیت یہاں اس ٹوٹی ہوئی شاخ کی سی ہے جو درخت سے علیحدہ ہو چکی ہے؟'

'نہیں..... نہیں، ہرگز نہیں.....' بڑی بے چارگی سے اس نے اپنے سر کو جھٹکا دیا۔

بڑے سے آنگن میں آم اور شریفے کے پیڑ اسی طرح جھوم رہے ہیں، اس کی بوڑھی نحیف جاں بہ لب ماں سامنے کے پلنگ پر پڑی کھانس رہی ہے اور بڑی حسرت بھری نگاہوں سے اپنے اجنبی ہوتے ہوئے لختِ جگر کے ملول چہرے پر کچھ ڈھونڈنے کی کوشش کر رہی ہے۔ اس کے دیگر عزیز و اقارب بھی موجود ہیں..... سب کچھ تو ہے یہاں اس کا، اس کا منہدم ہوتا ہوا گھر، اس کی ماں..... اس کے عزیز و اقارب..... مگر..... مگر وہ خود یہاں کا نہیں رہا..... وقت کے ایک لمبے سفر نے اسے خود اس کے گھر میں ہی بیگانہ بنا دیا ہے۔ اس پر غیریت کی مہر اس طرح ثبت ہو چکی ہے کہ اسے اپنوں کے برتاؤ میں بھی تصنع کی جھلک نظر آ رہی ہے۔ وہ اس مصنوعی زندگی سے اکتا رہا ہے۔ اسے تلاش ہے اپنے آپ کی..... اس اپنے پن کی جسے برسوں پہلے وہ خود اسی دہلیز پر چھوڑ گیا تھا۔

اپنا پن زندگی کو خوشگوار بنانے کے لئے کس قدر ضروری ہے، اس بات کو اس نے پہلے تو کبھی محسوس نہیں کیا

تھا۔ لیکن ایک لمبے عرصے تک مشینی زندگی گزارنے کے بعد کسی چیز کی کمی کا احساس اس طرح سوہان روح بنا کہ وہ ہر آسائش کو لمحوں میں بھول گیا۔

اسے وہ دن بھی یاد تھا جب وہ اپنی جانی پہچانی دنیا کو خیر باد کہہ کر ایک ان دیکھی دنیا کی طرف پرواز کر رہا تھا۔ اس وقت اس کے کانوں میں صرف ایک ہی آواز گونج رہی تھی۔

'یار، اب تک تم تالاب کے مینڈک بنے رہے، باہر نکل کر دیکھو، دنیا کتنی حسین ہے۔ کیا تم نے اعلیٰ تعلیم اور اونچی ڈگریاں اسی لئے حاصل کی ہیں کہ صبح سے شام تک چپل توڑتے رہو......؟' اس نے بدیشی دوست کے اس مشورے کا پر جوش استقبال کیا اور اس دن وہ بے حد خوش تھا جب اس کا ویزا باہر جانے کے لئے آ گیا تھا۔

وہ اس منظر کو بھی نہیں بھولا ہے جب وہ ایئر پورٹ پر اپنے جہاز کا انتظار کر رہا تھا...... اس وقت اس کے سامنے ایک حسین دنیا آباد تھی اور وہ نرم ہواؤں کے دوش پر جھولا جھول رہا تھا۔ اچانک زندگی کتنی سبک رفتار، کومل اور پرکشش بن گئی تھی۔ زندگی کا سارا بوجھل پن نہ جانے کہاں کھو گیا تھا۔ جہاز کے اڑان بھرتے ہی وہ ساتوں آسمانوں کی سیر کرنے لگا تھا۔ کیسے کیسے رنگین خیالات اس کے ذہن میں فلم اسکرین کی طرح منٹوں میں سین بدل رہے تھے۔ اپنی نحیف و ناتواں ماں، بیمار والد کو بھی چھوڑنے کا اسے ذرا غم نہیں تھا۔ بچپن کے دوست، سب شناسا چہرے اچانک اجنبی بن گئے۔ اسے محسوس ہوا جیسے وہ قید خانے سے نکل کر کھلی فضا میں کلیلیں بھرنے لگا ہے۔

خوبصورت اور اسمارٹ ایئر ہوسٹس جب اس کے سامنے کھانے کی پلیٹ سجائے آئیں تو اسے لگا جیسے وہ جنت کی حوریں ہیں جو من و سلویٰ کے ساتھ اس کی میزبانی کر رہی ہیں۔ اس نے ان کے دست نازنین سے پلیٹ لیتے ہوئے کنکھیوں سے انہیں دیکھا۔ ایئر ہوسٹس نے دلنواز مسکراہٹ کے ساتھ دریافت کیا۔ 'کیا اور بھی چاہئے کچھ آپ کو......؟'

اس نے ہکلاتے ہوئے جواب دیا۔ 'نہیں...... ہاں......' اور پھر خود ہی اپنی اس بوکھلاہٹ پر بری طرح جھینپ گیا۔ اس کے دل میں لمحہ بھر اس دلنواز مسکراہٹ پر گدگدی ہوتی رہی، لیکن پھر اس مسکراہٹ کی اصلیت اس پر واضح ہو گئی تھی، جب وہی ایئر ہوسٹس اس کے پہلو میں بیٹھے ہوئے بوڑھے پنجر سے بھی اسی دلنواز مسکراہٹ کے ساتھ مخاطب تھی۔

'اوہ! تو یہ ادائیں جلوۂ عام ہیں جن کو میں نے اپنے لئے مخصوص سمجھ لیا تھا۔' اپنی شخصیت کا سحر اسے ٹوٹتا ہوا محسوس ہوا۔ عمر کا یہ حصہ بھی کیسا پرفریب ہوتا ہے۔ منٹوں میں آسمان پر اور منٹوں میں زمین پر..... جھوٹ کیا ہے اور سچ کیا، اس بات کی تمیز اس عمر میں ذرا مشکل سے ہوتی ہے۔ اس کی آنکھوں پر بھی ایک رنگین عینک چڑھی ہوئی تھی اور وہ ہر شئے کو بس اسی عینک سے دیکھ رہا تھا۔

بدیس پہنچ کر کچھ دنوں تک وہ ایک جادوئی دنیا میں کھویا رہا۔ گرد و پیش کو رنگین عینک سے دیکھنے کی تقریباً اسے عادت سی ہوگئی تھی لیکن کچھ عرصہ گزر جانے کے بعد اس کی عینک کا شیشہ میلا ہونے لگا۔ اس کا معمول بن گیا تھا کہ گھر سے باہر قدم نکالتے وقت پہلے وہ اپنی عینک کے شیشے کو خوب صاف کرتا تاکہ وہ پہلی سی چمک واپس آجائے، مگر یہ دیکھ کر اسے بڑا دکھ ہوتا کہ شیشہ صاف ہونے کی بجائے میلا ہی ہوتا جا رہا تھا۔ انہی لمحوں میں اسے ایسا لگتا جیسے کوئی چیز چھناکے کے ساتھ اس کے اندر ٹوٹ گئی ہو اور اس کی ساری کرچیاں اندر ہی اندر چبھتی چلی جا رہی ہیں۔ ایک عجیب سی بے چینی کا مسکن بن گیا تھا اس کا دل و دماغ.....

کبھی کبھی وہ اپنے وجود کو پنڈولم کی طرح جھولتا محسوس کرتا، لامحدود فضاؤں میں معلق زمین سے منقطع اور آسمان سے دور.....

'یا الٰہی یہ کیسا جہاں ہے؟ باہر کی دنیا کیسی خوبصورت ہے لیکن اندر کی آتما کو چین نہیں۔ یہاں تو ہر شخص بس اپنے 'آج' میں جی رہا ہے۔' وہ اکثر غور و فکر میں ڈوبا رہتا۔

'کیا کل کے اعتبار کے بغیر آج کا حسن برقرار رکھا جا سکتا ہے۔؟'

'نہیں، ہرگز نہیں۔' اس کے اندر سے کوئی چیخ ابھرتی.....

'وقت، ماضی، حال اور مستقبل سے عبارت ہے۔ تم اسے صرف حال سے تعبیر نہیں کر سکتے۔'

اسے حیرت ہوتی ان ہم وطنوں پر جو صرف حال کے سہارے زندہ تھے۔ وہ اکثر ان کے چہروں کو پڑھنے کی کوشش کرتا۔

ایک دن اس نے اپنے قریبی دوست اسد سے دریافت کیا جو خود ان کی کمپنی میں ملازم تھا۔ 'یار اسد! یہاں کے لوگ کیا اپنی زندگی سے مطمئن ہیں.....؟ ان کا حال تو یقیناً خوبصورت ہے مگر مستقبل کا کوئی بھروسہ نہیں۔ کیا

اس بے اعتباری کے ساتھ کوئی حساس شخص خوش رہ سکتا ہے؟'

اسد نے غور کرتے ہوئے کہا، 'یار! تم ضرورت سے زیادہ حساس ہو۔ یہاں کے لوگ شاید اتنے حساس نہیں ہوتے۔'

'کیا مشینی عہد میں رہتے ہیں یہ بھی، روبوٹ (ROBOT) ہو گئے ہیں.....؟' اس نے مسکراتے ہوئے طنز کیا۔

'ممکن ہے۔' اسد نے مختصر سا جواب دیا۔

'نہیں یار اسد! مجھے تو ایسا لگتا ہے جیسے آج کے عہد کا انسان کچھ زیادہ ہی حساس ہو گیا ہے۔ ماحول کی سرد مہری نے اس کے اندر کی آگ کو کچھ زیادہ ہی بھڑکا دیا ہے۔'

'یہ سب تمہارا واہمہ ہے۔ اپنا مسئلہ تو صرف پیٹ کی آگ ہے۔' اسد کی مسکراہٹ میں درد بھی تھا اور طنز بھی، جسے بڑے سلیقے سے وہ چھپا رہا تھا۔

اسے اکثر اپنے جیسے دوسرے ساتھیوں کی زندگی پر ملال ہوتا، وہ جو سارا دن کڑی محنت کرتے اور جب گئی رات بستر پر لوٹتے تو بیوی بچے سب کو سویا ہوا پاتے..... پھر علی الصبح ساری کائنات کو سویا ہوا ہی چھوڑ کر اپنے اپنے کاموں میں چلے جاتے..... ان میں اکثر تو ہفتوں اپنے بچوں سے جی بھر بات بھی نہ کر پاتے..... بیوی کی مسکان کیا معنویت رکھتی ہے—؟ اس بات کا احساس بھی کھوتے جا رہے تھے۔ گویا ان کی زندگی کوئی سیال مادّہ ہو جو مشین میں ڈھل گئی ہو اور تیز چلتی ہوئی مشین کی گھر گھر کے ساتھ اندر کا ہر لطیف احساس بھی زائل ہو چکا ہو— وہ زیر لب کراہتا۔

'کیا زندگی صرف پیسے سے مطمئن ہو جاتی ہے—؟' باہر آ کر وہ بھی یقیناً اچھی غذا کھا رہا تھا، اچھی خاصی رقم جمع کر رہا تھا۔ فریج، ٹی وی، اے سی، بہترین ایر کنڈیشنڈ کار، ویل فرنیشڈ مکان، سب کچھ کم ہی مدت میں اس نے حاصل کر لیا تھا۔ لیکن اکثر راتیں اس کی فوم کی آرام دہ مسہری پر کروٹیں بدلتے ہی گزر جاتیں— جب بھی کبھی گھر سے اس کی ماں یا کسی اپنے پرائے کا خط آتا تو وہ ہفتوں تک مضمحل مضمحل سا رہتا— بوڑھے باپ کے انتقال کی خبر ملی تو وہ جی بھر کے رو بھی نہ سکا۔ ماں کی علالت کی اطلاع ملی مگر وہ صرف تڑپ کر رہ گیا تھا۔

لیکن یہ کیسا وقت آ گیا ہے کہ ایک طویل عرصہ گزار چکنے کے بعد اچانک وہاں کی سنہری سرزمین پر بھی وحشت کے بادل منڈلانے لگے ہیں— ہر شخص اپنی اپنی جگہ سہم رہا ہے۔ ان میں سے بیشتر بغیر کچھ سوچے سمجھے بنا زادِ راہ کے ہی رختِ سفر باندھنے پر مجبور ہو گئے ہیں۔

وہ بھی اپنی چھوٹی سی فیملی کے ساتھ واپس آ چکا ہے اور اپنے گھر کی دہلیز پر دیر سے کھڑا بیتے لمحوں کو واپس بلانے کی کوشش کر رہا ہے مگر اسے لگ رہا ہے جیسے یہ گھر اب اس کا اپنا گھر نہیں رہا..... در و دیوار کی ساخت تو وہی ہے، آم کے پیڑ اور شریفے کے پیڑ بھی وہی ہیں مگر اس کے قدموں کے نیچے کی زمین بہتا پانی بن گئی ہے۔ سخت دھوپ سے گھبرا کر اس نے نگاہیں اوپر کیں تو چھت کا سایہ بھی سر سے غائب تھا۔

لفظ و معنی

قدرے - تھوڑا

باعث - وجہ

اجنبی - بیگانہ

پنہاں - چھپا ہوا

بے بس - مجبور

سبک رفتار - سست رفتار

نحیف - کمزور

جاں بہ لب - مرنے کے قریب

شناسا - جان پہچان

تصنع - بناوٹ، ریاکاری

باطن - اندرونی

سیال مادہ - بہتی ہوئی چیز

سرد مہری - غفلت، نظر انداز کرنا

دلدار - دل رکھنے والا، محبوب

منہدم - ڈھادینا

پرواز - اڑان

آپ نے پڑھا

- آج کے جدید سائنسی اور مادی ماحول میں معاشرے میں جو مسائل پیدا ہو رہے ہیں، ان مسائل کو ہی قمر جہاں نے اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے۔ چنانچہ زیر نصاب افسانہ 'کٹی ہوئی شاخ' اسی پس منظر سے متعلق ہے جس میں ایک شخص روپیہ کمانے کے لئے خلیجی ممالک جاتا ہے۔ روپیہ تو خوب کمالیتا ہے لیکن اپنے معاشرے اور تہذیب سے کٹ کر جس ذہنی کرب واذیت کا شکار ہوتا ہے، اس کیفیت کی ترجمانی اس افسانے میں بدرجہ اتم موجود ہے۔
- موجودہ عہد کی سائنسی ترقیوں اور ان کی ایجادات نے انسانی تہذیب کو تو متاثر کیا ہی ہے ساتھ ہی اخلاقی پہلو کو مجروح بھی کیا ہے۔ اسی موضوع پر ارتکاز کر کے افسانے کا مرکزی خیال پیش کیا گیا ہے جس میں مادیت کا غلبہ ہوگیا ہے۔ اسی پس منظر میں زیر نصاب افسانہ میں افسانہ نگار قمر جہاں نے ایک ایسے کردار کو پیش کیا ہے جو روپیہ کمانے کے لئے خلیجی ممالک جاتا ہے، روپیہ بھی خوب کماتا ہے، لیکن وہ معاشرے اور تہذیب سے کٹ کر جس ذہنی کرب واذیت کا شکار ہوتا ہے، اس کیفیت کی ترجمانی اس افسانے میں بدرجہ اتم موجود ہے۔

مختصر ترین سوالات

1. قمر جہاں کی پیدائش کب ہوئی؟
2. قمر جہاں کے والد کا نام کیا ہے؟
3. قمر جہاں کا پیدائشی تعلق صوبہ بہار کے کس ضلع سے ہے؟
4. قمر جہاں کا کون سا افسانہ آپ کے نصاب میں شامل ہے؟
5. قمر جہاں کس یونی ورسٹی میں استاد ہیں؟

مختصر سوالات

1. قمر جہاں کے حالاتِ زندگی پر پانچ جملے لکھئے۔
2. قمر جہاں کی تصانیف کی فہرست موضوع کے اعتبار سے لکھئے۔
3. قمر جہاں کی تعلیم وتدریس کے بارے میں مختصراً بیان کیجئے۔

4. اردو کے کسی پانچ افسانہ نگاروں کے نام لکھئے۔

طویل سوالات

1. قمر جہاں کے افسانوں کے موضوعات پر روشنی ڈالئے۔
2. کہانی کا عنوان 'کٹی ہوئی شاخ' کیوں ہے؟ واضح کیجئے۔
3. 'مہاجر ادب' کی اصطلاح سے آپ کیا سمجھتے ہیں؟ کیا یہ افسانہ اس زمرے میں ہے؟ مدلل جواب دیجئے۔
4. کہانی کے مرکزی کردار کی ذہنی و جذباتی کیفیت کو اختصار میں لکھئے۔

آیئے، کچھ کریں

1. اپنے استاد کی مدد سے بہار کی خواتین افسانہ نگاروں کی ایک فہرست بنایئے۔
2. موجودہ سائنسی دور میں افسانہ نگاری کی افادیت پر ایک مذاکرہ کا اہتمام کیجئے۔

نگار عظیم

نگار عظیم عہد حاضر کی ایک اہم افسانہ نگار ہیں۔ ان کا اصل نام ملکہ مہر نگار ہے۔ قلمی نام نگار عظیم ہے۔ وہ اردو دنیا میں مشہور و مقبول ہیں۔ اردو کے علاوہ انہوں نے ڈرائنگ اور پینٹنگ میں بھی ایم اے کیا۔ انہوں نے سعادت حسن منٹو کی افسانہ نگاری کا تنقیدی جائزہ پیش کر کے جامعہ ملیہ اسلامیہ سے پی ایچ ڈی کی ڈگری بھی حاصل کی ہے۔ اس وقت خواتین افسانہ نگاروں میں ان کی خاص پہچان یوں بھی بنتی ہے کہ انہوں نے خواتین کے جذبات و محسوسات اور ان کے مسائل پر متعدد افسانے لکھے ہیں۔ جبر و استحصال اور موجودہ معاشرے کی انسانیت سوز صورت حال پر انہوں نے نہایت اثر انگیز افسانے لکھے ہیں۔

نگار عظیم کے افسانوں کا پہلا مجموعہ 'عکس' کے نام سے 1990ء میں شائع ہوا۔ اس کے بعد 1999ء میں مجموعہ 'کہن' شائع ہوا۔ افسانوں کے علاوہ انہوں نے سفرنامے اور تنقید کے میدان میں بھی نمایاں کام کئے ہیں۔ انہوں نے ہرچرن سنگھ چاؤلہ کی شخصیت اور فن کا جائزہ پیش کیا ہے۔ بہادر شاہ ظفر کی شخصیت اور ان کی شاعری پر بھی ان کی اہم تنقیدی کتاب شائع ہو چکی ہے۔ نگار عظیم نے 'گرد آوارگی' کے نام سے ایک سفرنامہ بھی لکھا ہے جو خاصا مقبول ہوا۔

ABDIEL SOLUTIONS ABSOL PATNA

آشیانہ

اپنے بڑے بیٹے سراج اور بہو عرفانہ کے ساتھ رہتے ہوئے کئی برس بیت گئے تھے۔ ہر طرح کا سکھ چین تھا۔ یہاں دونوں ہر وقت ہر بات کا خیال رکھتے۔ ہر طرح کے عیش و آرام اور محبتوں سے نوازتے۔ دو پیارے پیارے پوتے بھی اللہ نے عطا کئے۔ عدنان تقریباً نو برس کا ہو گیا تھا اور فرحان ابھی پانچ برس کا۔ دونوں اسکول جاتے۔ دادا دادی سے محبت کرتے۔ پوکے مان، ہی مین اور بیسلیٹ کے قصے سناتے۔

لیکن ان سب کے باوجود اندر ہی اندر ایک طرح کا خالی پن، اداسی اور اکتاہٹ سی بھری رہتی۔ کبھی کبھی یہ اداسی گھٹن بن جاتی اور یہ سوچنے پر مجبور کر دیتی کہ آخر ایسا کیوں؟ میرے شوہر برکت علی صدیقی ایک اچھے عہدے پر فائز تھے۔ اپنا چھوٹا سا مکان تھا۔ اللہ کا دیا سب کچھ تھا۔ ہمارے دو بچے تھے۔ دونوں کی پرورش اور اعلیٰ تعلیم میں عمر کا پہیہ اتنا تیز چلا کہ احساس ہی نہیں ہوا کب بوڑھے ہو گئے۔ بیٹی رقیہ کی ذمہ داری سے سبک دوش ہوئے اور سراج کی بنگلور ملازمت لگی تو اکیلے پن نے گھیر لیا۔ رقیہ اپنے خاندان کے ساتھ خوش و خرم اور آباد تھی۔ شروع شروع میں تو جلدی جلدی بیٹی داماد آتے لیکن جیسے جیسے دن گزرے ان کی مصروفیتیں بڑھیں تو بس بطور مہمان آتے۔ اور پھر سراج کی شادی ہوئی اور وہ بھی اپنی بیوی کے ساتھ بنگلور آباد ہو گیا۔ لیکن برکت جیسے ہی ریٹائر ہوئے، سراج اور عرفانہ ضد پکڑ کر اپنے ساتھ بنگلور لے گئے۔ اور وہ آشیانہ جو ہم نے تنکا تنکا کر کے بنایا تھا بیٹے بہو کی محبت میں بہت دور چھوٹ گیا۔ بیٹے بہو نے خدمت گزاری اور دلجوئی میں دن رات ایک کر دیئے۔ کبھی کبھی ہم دونوں میاں بیوی اس خدمت سے شرمسار بھی ہوئے۔ جب ناشتے کی میز پر بہو سلائس پر مکھن کی موٹی تہہ لگا کر پیش کرتی تو یہ بھی مسکراتے اور میں بھی ہنس پڑتی اور کہتی پیاری بہو رانی اس عمر میں اتنا مکھن کھلاؤ گی تو دس بیماریاں اور پل جائیں گی اور تمہارا کام اور بڑھ جائے گا۔

اللہ نہ کرے امی جان۔ بیمار ہوں آپ کے دشمن۔ ایسا نہ کہیے۔ اس عمر میں کھائیں گی نہیں تو طاقت کہاں

سے آئے گی۔ کیوں ابو جان؟ اور ابو جان مسکرا پڑتے۔

کھانے پینے اور پھل فروٹ سے لے کر روز مرہ کی تمام ذمہ داریوں اور ضرورتوں کا وہ پورا خیال رکھتے۔ کچھ وقت پوتوں کے ساتھ باتیں کرنے، ان کے کھیل سیکھنے میں گزر جاتا۔ سراج آفس چلا جاتا۔ بہو گھر کے اور باہر کے کاموں میں مصروف رہتی۔ نئے زمانے کی ہوتے ہوئے بھی وہ پرانی قدروں سے جڑی ہوئی تھی۔ واقعی سراج کی پسند لاجواب تھی۔ دونوں میں کبھی کبھی تکرار بھی ہوتی۔ کیونکہ عرفانہ گھر کی نہ ہوکر ملازمت بھی کرنا چاہتی تھی۔ جبکہ سراج اسے غیر ضروری سمجھتا تھا۔ اسے اللہ نے اچھی ملازمت اور ہر آرام مہیا کیا تھا اور وہ عرفانہ کو خواہ مخواہ نوکری کے جوکھم میں نہیں ڈالنا چاہتا تھا۔

ابتدا میں بنگلور آکر ان کے ساتھ رہنا بہت اچھا اور خوشگوار لگا۔ نہ کھانے پکانے کی فکر نہ دال دلیے کا حساب، نہ پاس پڑوس اور آنے جانے والوں کا جھنجھٹ۔ لفٹ سے ساتویں منزل پر چڑھتے اور اترتے۔ کس فلیٹ میں کون رہتا ہے کیا کرتا ہے، مردہ یا زندہ کون جانے؟ بہت کوشش کرتی بہو کوئی کام کرنے دے لیکن وہ ہاتھ ہی لگانے نہ دیتی۔ دل چاہتا کہ برکت اور سراج کی پسند کی ڈش میں بھی بناؤں لیکن عرفانہ اتنے پیار سے منع کرتی کہ میں خاموش ہو جاتی۔

'کیا امی جان؟ ساری عمر تو ہوگئی آپ کو کام کرتے، پکاتے کھاتے، بس اب آپ کے آرام کے دن ہیں۔ سراج بتاتے ہیں آپ بہت کام کرتی تھیں۔ بہت اچھے کھانے پکاتی تھیں۔ لیکن اب نہیں اب میں ہوں نا!'

اور میں کچن سے باہر نکل آتی۔

سراج بھی عرفانہ کی زبان بولنے لگتا—امی آپ آرام کیجیے۔ آپ کام کیوں کرتی ہیں۔ عرفانہ کو پریشانی ہوگی تو نوکر رکھ لے گی۔'

حالانکہ صفائی ستھرائی برتن جھاڑو اور کپڑے دھونے کے لیے دو دو آیا لگی ہوئی تھیں۔ لیکن عرفانہ کھانا ہمیشہ خود ہی پکاتی۔ اچھا اور ذائقہ دار پکاتی۔ مجھے کئی مرتبہ احساس ہوا کہ دو دو ملازماؤں کو پیسہ جاتا ہے۔ یہ چھوٹے موٹے گھر کے کام تو میں بھی کرسکتی ہوں لیکن سراج اور عرفانہ نے اس طرح کبھی نہیں سوچا کہ میں کام کروں۔ انہیں تو میرا آرام بے حد پسند تھا۔ کبھی کسی کام کے لیے ملازمہ کو ٹوکتی کہ سبزی ایسے دھوؤ، فریج میں ایسے رکھو۔ کپڑے

ایسے پھیلاؤ، سفید کپڑوں کے ساتھ رنگین کپڑے نہ دھوؤ تو سراج فوراً بول پڑتا۔ ارے امی یہ دردسر آپ کیوں مول لیتی ہیں۔ اس کے لئے تو آپ کی بہو ہی کافی ہے۔ آپ کیوں پریشان ہوتی ہیں؟ اب میں کیا سمجھاؤں کہ میں پریشان نہیں ہوں۔ اس گھر پر اپنا حق سمجھتی ہوں۔ یہ میرے بیٹے اور بہو کا گھر ہے۔ یہ گھر پرایا نہیں ہے۔ صفائی ستھرائی یا گھر کے کام کاج پر میں نظر نہیں رکھوں گی تو کون رکھے گا؟ آخر میں گھر کی بڑی ہوں۔ بہو پر ابھی سے اتنی ذمہ داریاں ٹھیک نہیں۔ لیکن میں ایسا کچھ بھی نہیں کہتی۔ بس خاموش ہو جاتی۔

دراصل عرفانہ نے اپنے گھر کے نظام اور حقوق میں کسی دخل اندازی کی کوئی گنجائش ہی نہیں چھوڑی تھی۔ میں شکایت کرتی بھی تو کس بات کی۔ ان دونوں نے بڑی عزت، محبت اور احترام کے ساتھ مہمانوں کی طرح اپنے گھر میں اور دل میں جگہ دی تھی۔ جب کبھی دونوں میں ناراضگی یا کھٹ پٹ ہوتی تو موقع دیکھ کر سراج سے کہتی۔

'بہو اگر ملازمت کرنا چاہتی ہے تو کرنے دو پڑھی لکھی ہے۔ آج کل سب لڑکیاں کرتی ہیں اور پھر میں ہوں نا..... گھر کی تمام ذمہ داری میں سنبھال لوں گی۔ خالی ہی تو بیٹھی رہتی ہوں۔ یہاں مجھے کوئی کام ہی نہیں۔ پھر دو دو آیا لگی ہوئی ہیں۔'

'نہیں امی یہ مسئلہ نہیں۔ ان بڑے شہروں کے مسائل ہی دوسرے ہیں۔ دن بھر بسوں اور ٹرینوں میں دھکے کھانے پڑتے ہیں اور بھی کئی باتیں ہیں اور پھر خدانخواستہ کوئی پریشانی ہو تو چلو ٹھیک ہے۔ میرا اب پرموشن ہونے والا ہے۔ میری سیلری اور بڑھ جائے گی اور پھر کون سا بہت بڑا کنبہ ہے ہمارا.....'

سراج کے دلائل سن کر میں خاموش ہو جاتی اور بہو بھی بول پڑتی۔

'امی آپ فکر نہ کیجیے۔ ان کی عقل میں میری بات آئے گی ہی نہیں۔'

دن یوں تو بہت آرام سے گزر رہے تھے۔ لیکن دل کی نیا ڈولتی رہتی۔ برکت بھی بیٹے کے یہاں بظاہر خوش اور مطمئن نظر آئے لیکن ان کی بے چینی میری نظروں سے پوشیدہ نہ تھی۔ میں برکت کے مزاج کو بہت اچھی طرح جانتی تھی۔ لیکن ایک انجانا سا خوف مجھے ان کے دل کے تاروں کو چھیڑنے سے روکے رہتا۔ اس میں رتی برابر بھی شک نہیں کہ ہمارا بیٹا اور بہو بہت لائق باادب اور ہزاروں میں ایک تھے۔ ہمیں تو ان پر فخر ہونا چاہئے تھا۔ ان کے گن بیان کرنے چاہئے تھے۔ جیسے عرفانہ اپنی سہیلیوں سے ہمارے گن گاتی تھی۔ لیکن ہمیں اتنا موقع بھی کہاں ملتا

تھا۔ یا پھر شاید ہم خود کو ہی نہیں سمجھ سکے کہ ہم چاہتے کیا ہیں؟ اپنا ہاتھ اختیار؟ اپنی بادشاہت؟ ہم عمر ساتھی؟ عیش و آرام؟ یا پھر اپنا پن؟

ہم سب جب کبھی ایک ساتھ بیٹھتے اور پرانی باتیں چھڑتیں تو مجھے احساس ہوتا برکت کے اندر بھی کہیں نہ کہیں مایوسی پنپ رہی ہے۔ نہ جانے وہ کیا سوچتے رہتے تھے۔ اور پھر ایک روز وہ خود ہی بول پڑے۔

'تھک گیا ہوں میں آرام کرتے کرتے اور کتابیں پڑھتے پڑھتے۔ مجھے یہاں آنے کے بجائے کہیں کوئی کام یا نوکری کرنا چاہئے تھی۔ شاید ہم نے یہاں آکر غلطی کی زرینہ۔ یہ ہمارا گھر نہیں ہے۔ یہ تو بیٹے اور بہو کا گھر ہے۔ ہم تو اس گھر کے مہمان ہیں۔ اور مہمان تو دن دو دن کا ہوتا ہے برسوں کا نہیں۔ اسی مہمانی میں دو برس گزار دیئے ہم نے۔ بہت ہوئے ہیں دو برس۔ اب میں بیمار سا ہوگیا ہوں۔ کیا تم اپنے بیٹے بہو کو چھوڑ کر میرے ساتھ اپنے چھوٹے سے گھر میں واپس چلوگی۔ جہاں تم پکاؤ گی اور میں کھاؤں گا۔ چٹنی روٹی ہی سہی۔ اپنا پڑوس ہوگا، شام کی محفلیں ہوں گی اور پھر بیٹا بہو چھوٹ تھوڑے ہی جائیں گے۔ ہم سب آتے جاتے رہیں گے۔'

برکت کی محبت اپنائیت اور خوداعتمادی نے میرے اندر سیکڑوں چراغ روشن کردیئے اور ہم نے پھر اپنا آشیانہ آباد کرنے کا فیصلہ لے لیا۔

لفظ و معنی

عطا کرنا ۔ دینا

فائز ہونا ۔ مقرر ہونا، عہدے پر رہنا

سبک دوش ۔ ملازمت کی مدت پوری کرلینا، فارغ ہوجانا

دل جوئی ۔ خوش کرنا، خیال رکھنا

شرمسار ۔ شرمندہ

نظام ۔ انتظام، قرینہ

خوداعتمادی ۔ اپنے آپ پر بھروسہ

جوکھم ۔ دشواری، پریشانی

آپ نے پڑھا

- اس کہانی میں افسانہ نگار نے خوش حال اور فارغ البال مرد اور عورت کی نفسیات کو پیش کیا ہے جنہیں ضعیفی میں اپنے بیٹے اور بہو کے ساتھ رہنا پڑتا ہے۔ مشترکہ خاندان میں نہ صرف کمزور معاشی طبقے کے افراد کے لئے مسائل کھڑے ہوتے ہیں بلکہ اکثر صورتوں میں خوش حال افراد بھی اول اول اکتاہٹ محسوس کرتے ہیں اور پھر آپس میں ناچاقی بڑھتی جاتی ہے۔ برکت علی صدیقی اور ان کی بیگم کو جب اپنے بیٹے سراج اور بہو عرفانہ کے ساتھ رہنا پڑا تو رفتہ رفتہ اچھے تعلقات میں دراڑ پیدا ہونے لگی۔ افسانہ نگار نے اکتاہٹ اور یکسانیت سے پیدا ہونے والے خانگی انتشار کو کرداروں کی نفسیات کی روشنی میں بڑی خوبصورتی کے ساتھ پیدا کیا ہے۔

مختصر ترین سوالات

1. نگار عظیم کا اصل نام کیا ہے؟
2. نگار عظیم نے کس کس موضوع میں ایم اے کیا؟
3. نگار عظیم کے اولین افسانوی مجموعے کا نام کیا ہے؟
4. نگار عظیم کا مجموعہ 'گہن' کب شائع ہوا؟
5. نگار عظیم کے سفر نامہ کا نام کیا ہے؟

مختصر سوالات

1. 'سہی' اور 'صحیح' کے فرق کو جملے میں استعمال کر کے واضح کریں۔
2. نگار عظیم کی شخصیت پر پانچ جملے لکھئے۔
3. صنف افسانہ پر پانچ جملے لکھئے۔

طویل سوالات

1. سراج کی والدہ اپنے بیٹے کے گھر پر اکتاہٹ کیوں محسوس کرنے لگی؟
2. زیر نصاب افسانہ 'آشیانہ' کے مرکزی کردار پر روشنی ڈالئے۔
3. افسانے کے ارتقاء کا جائزہ لیجئے۔

4. نگار عظیم کی افسانوی خصوصیات بیان کیجئے۔

- مندرجہ ذیل الفاظ کی جمع بنائیے۔

ضد، خدمت، موقع، مسئلہ، منزل

آیئے، کچھ کریں

1. اپنے استاد کی مدد سے بہار کے مختصر افسانہ نگاروں کی ایک فہرست بنائیے۔
2. بہار میں کن کن موضوعات پر مختصر افسانے لکھے جا رہے ہیں، اس پر ایک مذاکرہ کا اہتمام کیجئے۔

مضمون

یہ ایک قدیم نثری صنف ہے جس میں کسی ایک مخصوص عنوان پر سیر حاصل بحث ہوتی ہے۔ مضمون مختصر بھی ہوتا ہے اور طویل بھی۔ ضرورت اور معیار کے مطابق مضمون لکھا جاتا ہے۔ آج کل تو پرائمری اسکولوں کے بچوں کو بھی مضمون نویسی کی تدریس دی جاتی ہے۔ مضمون نگاری میں کافی وسعت اور تنوع ہے۔ مضامین مختلف نوعیت کے ہو سکتے ہیں جیسے علمی مضامین، سائنسی مضامین، مذہبی، اخلاقی، اصلاحی اور سیاسی مضامین وغیرہ۔ مضمون نگاری میں کافی آزادی اور کشادگی ہے۔ ہم ایک جاندار اور معمولی چیزوں پر بھی مضمون لکھ سکتے ہیں۔ اسکول کے مضامین میں عنوان کی تشریح، اس کی صفات اور عیوب پیش کیے جاتے ہیں۔ معیاری مضامین میں علمیت اور جامعیت بھی ہوتی ہے اور قلم کار کے قلم و ذہن کی جولانیت بھی۔

ہر دور میں مضمون نویسی اردو کی نثری صنف کی ایک اہم صنف بنی رہی اور ہنوز یہ مقام مضمون نویسی کو حاصل ہے۔ آج پرائمری درجات اور ملک کے مقابلہ جاتی امتحانات کے نصابوں میں بھی یہ شامل ہے۔ فورٹ ولیم کالج سے اس کا آغاز ہوا اور سلسلہ ہنوز قائم ہے۔ ہمارے مشہور و معروف مضمون نگاروں میں سرسید احمد خاں، محسن الملک، محمد حسین آزاد، حالی، ذکاء اللہ، خواجہ حسن نظامی، رشید احمد صدیقی وغیرہ نے تو اس صنف کو کافی جلا بخشی ہے۔

عالمی حدّت (GLOBAL WARMING)

ہم لوگ جس زمین پر رہتے ہیں، وہ ایک سیارہ ہے۔ یہ زمین سبھی جانداروں کے لئے بہت مناسب ہے دوسرے سیاروں کا ماحول پودوں اور جانوروں کے لئے ٹھیک نہیں ہے یا تو یہ بہت ہی گرم ہے یا بہت ٹھنڈا۔ ہماری زمین کا درجۂ حرارت (Temperature) بہت موزوں ہے اور معتدل ہے اسی لئے یہاں طرح طرح کے پودے، جانور اور انسان پائے جاتے ہیں۔ لیکن پچھلے تیس چالیس برسوں سے ہماری زمین کا درجۂ حرارت رفتہ رفتہ بڑھ رہا ہے۔ زمین کے درجۂ حرارت میں جو اوسط اضافہ ہو رہا ہے اسے ماہرین ماحولیات نے 'تمازتِ ارضی میں تدریجی اضافہ' (Global Warming) کا نام دیا ہے۔

پوری دنیا میں پچھلے دس برسوں سے اس کا بہت ذکر اور چرچا ہو رہا ہے۔ آج گلوبل وارمنگ ایک سنگین عالمی مسئلہ اور چیلنج بن گیا ہے۔ دنیا کے سارے سائنس داں اس مسئلہ پر بہت فکرمند ہیں۔ امریکہ، جرمنی اور اقوام متحدہ (UNO) میں اس مسئلہ پر سائنس دانوں کے درمیان کافی تبادلۂ خیالات ہوئے اور اس سے مدافعت کے لئے کئی اہم اقدام ان ممالک میں لئے جا رہے ہیں۔

تم سوچ رہے ہوگے کہ آخر ہماری دنیا کا درجۂ حرارت کیوں بڑھ رہا ہے یعنی گلوبل وارمنگ کی وجہ کیا ہے؟ اس کی سب سے اہم وجہ خود ہم انسانوں کی کچھ سرگرمیاں ہیں جن کو سائنس کی زبان میں 'گرین ہاؤس گیسوں کے اثرات' (Effects of Green House Gases) کہتے ہیں۔ کل کارخانوں، موٹر گاڑیوں کے اضافے اور جنگلوں کے بے تحاشہ کٹنے سے گیسیں زیادہ پیدا ہو رہی ہیں۔ مثال کے طور پر آبخرہ، کاربن ڈائی آکسائیڈ (Co_2)، میتھن (CH_4)، نائٹرس آکسائیڈ (NO_2)، اوزون (Ozone) وغیرہ۔ ان میں کاربن ڈائی آکسائیڈ پہلے کے مقابلہ میں 31% اور میتھن 149% زیادہ پیدا ہونے لگی ہیں۔ میتھن گیس دھان کے کھیتوں اور گائے بھینس کے گوبر سے زیادہ نکلتی ہے۔ ہماری زمین پر آفتاب کی جو شعاعیں آتی ہیں، وہ انہیں زیادہ جذب کر لیتی ہیں اور اس کی وجہ سے زمین کا

ماحول گرم ہوجاتا ہے یا دوسرے لفظوں میں اس کا درجۂ حرارت بڑھ جاتا ہے۔

سائنس دانوں کا خیال ہے کہ ہماری زمین کا درجۂ حرارت پچھلے سو برسوں میں تقریباً 0.75^0c بڑھ گیا ہے۔ اگر یہی حالت رہی تو اس بات کا امکان ہے کہ اکیسویں صدی میں 1^0c سے 6^0c تک کا اضافہ ہوجائے۔ یہ بہت تشویش ناک بات ہے۔

زمین کے درجۂ حرارت بڑھنے کی وجہ سے سمندری برف کے بڑے بڑے تودے تیزی سے پگھلتے ہیں۔ اس کی وجہ سے سمندر میں پانی کی سطح تیزی سے بڑھ رہی ہے۔ ماہرین ماحولیات کا خیال ہے کہ اس کی وجہ سے کئی جزیروں کے ہمیشہ کے لئے سمندر میں ڈوب جانے کا اندیشہ ہے۔ پڑوسی ملک بنگلہ دیش کا کچھ حصہ، ہمارے دیش بھارت کے کچھ دکنی ساحلی علاقے، مالدیپ وغیرہ بھی ڈوب سکتے ہیں۔

تمازت ارضی میں تدریجی اضافہ (Global Warming) کی وجہ سے آب و ہوا میں بڑی تبدیلی آتی جارہی ہے۔ موسموں کی معینہ مدت میں بھی بدلاؤ آگیا ہے۔ کئی ٹھنڈے ملکوں میں اب کافی گرمی پڑنے لگی ہے۔ بہت سے جانور اور پودے دنیا سے ختم ہوتے جارہے ہیں۔ اس کے برعکس بیکٹر یا جراثیم اور وائرس زیادہ پنپنے لگے ہیں۔ جن سے کئی خطرناک قسم کی بیماریاں ہورہی ہیں۔ طوفان، سیلاب اور قحط کی کثرت ہے۔ گلوبل وارمنگ ایک عالمی مسئلہ ہے لیکن ہر ملک کو اپنے اپنے طور پر اس مہلک وبا سے بچنے کی ترکیبیں اور اقدام کرنے ہوں گے۔

ہمیں اب اس خطرناک مسئلہ کا مقابلہ کے لئے غور وفکر کرنا ہوگا۔ یہ ہمارے ملک کے ہر شہری کا فرض ہے کہ جس قدر ممکن ہو اس سے بچنے کے لئے ترکیب کرے اور حکومت کے ذریعہ اس کے لئے جو ہدایات دیئے جائیں، ان پر عمل کیا جائے۔ حکومت کے منصوبوں میں بھرپور تعاون کیا جائے۔

ان حالات میں ہم لوگ کیا کریں؟

ہم سبھی لوگوں کو اپنی زمین کو زیادہ گرم ہونے سے بچانے کی لگاتار کوشش کرنی ہوگی۔ دنیا کے بڑے اور ترقی یافتہ ممالک جیسے امریکہ، فرانس، جرمنی، چین، جاپان، انگلینڈ، کوریا اور روس کو گرین ہاؤس گیسوں کی مقدار کم کرنی ہوگی۔ جنگلوں کو کٹنے سے روکنا ہوگا۔ پودوں اور درختوں کو زیادہ سے زیادہ پھلنے اور پھولنے دیا جائے۔ زیادہ سے زیادہ پیڑ پودوں کو لگانے کی تحریک چلائی جائے۔ گیس پھینکنے والی گاڑیوں کو سڑکوں پر چلانے پر پابندی لگائی جائے۔

لکڑیوں اور کوئلہ کو کم سے کم جلایا جائے۔ ہم لوگوں کو فطرت (Nature) کے ساتھ زندگی گزارنے کی کوشش کرنی چاہئے۔ ۲۰۰۷ء میں کیوٹو (Kyoto) میں اس کے لئے ایک اہم کانفرنس بھی ہوئی تھی۔ اس کانفرنس میں ایک مشترکہ دستاویز تیار کی گئی جس پر مختلف ملکوں کے نمائندوں نے دستخط کئے اور حلف لیا گیا کہ ہر ملک اس دستاویز کی ہدایات کے مطابق گلوبل وارمنگ سے بچنے کے لئے اپنے اپنے ملک میں عمل کرے گا۔ اس تمازت کو کم کرنے کے لئے بہت سارے ملکوں میں کوششیں جاری ہیں۔ امریکہ کے سابق نائب صدر الگورے (Al Gore) نے پورے ملک میں گھوم گھوم کر گلوبل وارمنگ سے بچنے کے لئے تقریریں کیں، اشتہارات تقسیم کرائے اور ایک کتاب بھی تصنیف کی جس میں لوگوں کو اس کے خطرات، اثرات اور دفاع کے تراکیب سے روشناس کیا۔

۲۷ر دسمبر سے ۳۱ر دسمبر ۲۰۰۸ء تک پانچ دنوں کا بال وگیان کانگریس (Child Science Congress) ناگالینڈ کے شہر دیماپور میں منعقد کیا گیا جس میں مہمان خصوصی کے طور پر سابق صدر ہند اور عالم گیر شہرت یافتہ سائنس داں جناب اے پی جے عبدالکلام تھے۔ اس پانچ روزہ کانگریس کے دو ہی موضوعات تھے: 'پولوشن اور گلوبل وارمنگ'۔ اس کانگریس میں ملک کے ۳۲ صوبوں اور مرکزی حکومت کے مخصوص خطوں سے چن کر ۵۵۶ طلباء و طالبات کو شرکت کرنے کا موقع دیا گیا۔ پورے ملک سے ۱۶۵ اساتذہ نے بھی اس کانگریس میں حصہ لیا۔

بچو! دیکھو ہمارے ملک کی حکومت گلوبل وارمنگ سے بچنے اور نپٹنے کے لئے کتنے بڑے پیمانے پر کام کر رہی ہے۔ پورے ملک میں تحریک چلانے کی ضرورت ہے اور حکومت یہ کام آج کے طلباء و طالبات میں بیداری لاکر کرا رہی ہے۔ نئی نسل کے ابھرتے ہوئے بالغ طلبا اور طالبات پر ہی ملک کی ساری ذمہ داری آنے والی ہے۔ ان کے ذریعہ انقلابی صورت میں اس خطرہ سے بچنے کے تراکیب کرنے ہوں گے۔

مذکورہ بالا کانگریس میں مہمان خصوصی جناب اے پی جے عبدالکلام نے ان سنگین مسائل کو دور کرنے، حل کرنے اور بچنے کی ذمہ داری مکمل طور پر آج کے طلباء و طالبات پر دی۔ گلوبل وارمنگ کے سنگین مسائل پر بولتے ہوئے مہمان خصوصی نے کہا کہ اس سے نپٹنے کا اکسیر نسخہ یا جادوئی منتر یہ ہے کہ ۱۰ سے ۱۷ سال کی عمر والے بیس لاکھ بچے پانچ پانچ پیڑ لگا دیں تو ہمارے زیادہ تر مسائل حل ہو جائیں گے۔

ماخوذ

لفظ و معنی

تمازت - گرمی، حدت، تپش

ارضی - زمینی

تدریجی - رفتہ رفتہ، منزل بہ منزل

اضافہ - زیادتی، بڑھنا

حرارت - گرمی

موزوں - مناسب

معتدل - برابر، متوازن، ٹھیک

سنگین - پیچیدہ، تشویش ناک

مدافعت - بچاؤ، روکنا

سرگرمیاں - حرکات، کام، عمل

بے تحاشہ - لگاتار، بے شمار

آبخرہ - گرم پانی کا بھاپ

شعاعیں - کرنیں

امکان - ممکن

ماہرین ماحولیات - علم ماحولیات کے عالم حضرات

برعکس - برخلاف، الٹا

قحط - خشک سالی

مہلک - ہلاک کرنے والا، خطرناک

تعاون - مدد

مشترکہ - آپسی میل جول، ملا جلا

دستاویز - وثیقہ، عہد نامہ

دفاع - بچاؤ

عالمگیر - پوری دنیا میں

شہرت یافتہ - مشہور و معروف

عنوانات - موضوعات

بالغ - جوان

اکسیر - لاجواب، لاثانی، نہایت مفید

آپ نے پڑھا

- پچھلے تیس چالیس برسوں سے ہماری زمین کا درجۂ حرارت رفتہ رفتہ بڑھ رہا ہے۔ اس درجۂ حرارت میں جو اوسط اضافہ ہو رہا ہے، اس کو گلوبل وارمنگ کہتے ہیں۔
- گلوبل وارمنگ ایک سنگین عالمی مسئلہ ہے۔ دنیا کے سائنسداں اس کے لئے بہت فکرمند ہیں اور اس سے بچنے کے لئے غور و فکر کیا جا رہا ہے اور کچھ ملکوں میں اس کے لئے کئی اہم قدم اٹھائے گئے ہیں۔
- گلوبل وارمنگ کی وجہ گرین ہاؤس کی گیسوں کے اثرات، بے شمار کل کارخانوں کا کھلنا، تیزی کے ساتھ جنگلوں کا کٹنا اور موٹر گاڑیوں کی تعداد میں اضافہ ہے۔
- میتھن گیس دھان کے کھیتوں اور جانوروں کے گوبر سے زیادہ نکلتی ہے۔
- زمین کے درجۂ حرارت بڑھنے سے پودوں کا ختم ہو جانا اور خطرناک بیماریوں میں اضافہ، طوفان، سیلاب اور قحط کا سامنا جیسے حالات و حادثات کے ہم شکار ہو رہے ہیں۔
- گلوبل وارمنگ کو کم کرنے اور اس سے بچنے کے لئے دنیا کے بڑے ملکوں کو گرین ہاؤس گیسوں کی مقدار کو کم کرنا ہوگا، جنگلوں کو کٹنے سے روکنا ہوگا، پودوں اور درختوں کو زیادہ سے زیادہ لگایا جائے۔ شجرکاری کی تحریک چلائی جائے۔

معروضی سوالات

1. گلوبل وارمنگ کیسا مسئلہ ہے؟

(الف) مناسب (ب) خوشگوار (ج) سنگین (د) معتدل

2. کاربن ڈائی اکسائیڈ گیس میں کتنا اضافہ ہوا ہے؟

(الف) 21%　(ب) 31%　(ج) 14%　(د) 11%

3. زمین کا درجۂ حرارت پچھلے سو برسوں میں کتنا بڑھ گیا ہے؟

(الف) 0.45^0c　(ب) 0.55^0c　(ج) 0.65^0c　(د) 0.75^0c

4. بال وگیان کانگریس ۲۰۰۸ء بھارت کے کس شہر میں منعقد ہوا؟

(الف) پونا　(ب) شملہ　(ج) دیماپور　(د) وشاکھاپٹنم

5. کیوٹو میں گلوبل وارمنگ پر کانفرنس کب ہوئی تھی؟

(الف) ۲۰۰۷　(ب) ۲۰۰۶　(ج) ۲۰۰۵　(د) ۲۰۰۴

مختصر سوالات

1. زمین سبھی جانداروں کے لئے مناسب ہے یا غیر مناسب ہے؟
2. گلوبل وارمنگ کیسا مسئلہ ہے؟
3. گلوبل وارمنگ کیا ہے؟
4. گرین ہاؤس گیسوں میں کون کون گیس ہے؟
5. زمین کے درجۂ حرارت میں کاربن ڈائی اکسائیڈ اور میتھن گیسوں کا کتنا اضافہ ہوا ہے؟
6. گلوبل وارمنگ سے بچنے کے لئے طلباء کو عبدالکلام صاحب نے کون سا جادوئی منتر بتایا؟

طویل سوالات

1. گلوبل وارمنگ سے آپ کیا سمجھتے ہیں؟
2. گلوبل وارمنگ کے کیا اسباب ہیں؟
3. گلوبل وارمنگ کے تشویش ناک اثرات کیا ہوں گے؟
4. گلوبل وارمنگ سے بچنے کے لئے کیا کیا اقدام اٹھائے جاسکتے ہیں؟
5. اس سبق میں جن الفاظ میں سابقے ہیں، انہیں چن کر جملے بنائیے۔

آیئے، کچھ کریں

1. دو الگ الگ چارٹ پر گلوبل وارمنگ کے اسباب اور اثرات کو تصویر بنا کر اپنے درجہ میں آویزاں کریں۔
2. گلوبل وارمنگ سے بچنے کے پانچ اقدام جلی لفظوں میں لکھ کر اسکول کے نوٹس بورڈ، اسکول گیٹ اور اہم جگہوں پر آویزاں کریں اس کام میں اپنے سائنس ٹیچر کا تعاون لیں۔
3. سائنس ٹیچر کے تعاون سے آپ گلوبل وارمنگ کی تحریک اپنے علاقہ میں چلائیں۔ اس تحریک میں اپنے چند ساتھیوں کو بھی رکھئے۔ ہفتہ میں ایک روز ۲ گھنٹے کی یہ تحریک ہو اور اس کی رپورٹ اپنے سائنس ٹیچر کو لکھ کر دیں۔

ABDIEL SOLUTIONS ABSOL PATNA

سرسید احمد خاں

سرسید احمد خاں دلی کے ایک معزز گھرانے میں 1817ء میں پیدا ہوئے سرسید کی تربیت ان کی والدہ کے زیرسایہ ہوئی۔

تحصیل علم کے بعد 1862ء میں غازی پور میں انہوں نے ایک انجمن 'سائنٹفک سوسائٹی' کے نام سے بنائی۔

1869ء میں سرسید انگلستان گئے۔ واپس آکر انہوں نے 'تہذیب الاخلاق' نام سے ایک رسالہ جاری کیا جس میں سماجی، تہذیبی اور ادبی مضامین شائع ہوتے تھے۔

سرسید احمد خاں نے علی گڑھ میں ایک اسکول کھولا جو 1878ء میں 'محمڈن اینگلو اورینٹل کالج' بنا اور پھر علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کی شکل میں ابھر کر سامنے آیا۔

1878ء میں سرسید احمد خاں کو 'سر' کا خطاب ملا جو ان کے نام کا ایک حصہ بن گیا۔ سرسید احمد خاں کی تصانیف میں 'آثارالصنادید' اور 'اسباب بغاوت ہند' خاص طور پر اہمیت رکھتی ہیں۔

اردو کی نئی علمی نثر کی بنیاد ڈالنے کے ساتھ ساتھ سرسید نے اردو میں مختصر مضمون نگاری کو فروغ دیا۔ لمبی تحریروں کی بجائے چند صفحات میں کام کی باتیں کہنے کا فن سرسید نے عام کیا۔ سرسید کی نثر میں وہی وزن اور وقار ہے جو ان کی شخصیت میں تھا۔

سرسید احمد خاں کا انتقال 1898ء میں ہوا اور علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی میں دفن ہوئے۔

ریا

دنیا میں ایسے لوگ بھی بہت ہیں جن کا ظاہر کچھ اور باطن کچھ ہوتا ہے۔ دنیادار اور رند مشرب آدمی جس قدر کہ دراصل وہ بد ہیں اس سے زیادہ اپنے تئیں وہ بد بناتے ہیں۔ دینداری کی بناوٹ کرنے والے جس قدر کہ ہوتے ہیں اس سے زیادہ نیک اپنے آپ کو جتلاتے ہیں وہ تو دیندار کی ذرا ذرا سی باتوں سے بھی بھاگتے ہیں اور دن رات عشق و تماش بینی اور لچ پنے کی باتوں کی جن کو دراصل انہوں نے کی بھی نہیں، گپیں اڑاتے ہیں۔ اور یہ حضرت بے شمار گناہوں اور بدیوں کو ایک ظاہری دینداری کے پردہ میں چھپاتے ہیں اور ٹٹی کی اوجھل میں شکار کھیلتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ دونوں قسم کے آدمی چنداں برے نہیں ہیں مگر ایک اور تیسری قسم کے لوگ ہیں جو ان دونوں قسموں سے علیحدہ ہیں اور انہیں کا کچھ ذکر میں اس تحریر میں کرنا چاہتا ہوں۔ ان کی بناوٹ ایک اور ہی عجیب قسم کی ہے۔ وہ اپنی بناوٹ سے دنیا کے لوگوں ہی کو فریب نہیں دیتے بلکہ اکثر خود آپ بھی دھوکہ میں پڑتے ہیں۔ وہ بناوٹ خود ان کے دل کے حال کو چھپاتی ہے۔ جس قدر کہ درحقیقت وہ نیک ہیں اس سے زیادہ ان کو نیک جتاتی ہے۔ پھر تو وہ لوگ یا اپنی بدیوں پر خیال ہی نہیں کرتے یا ان بدیوں کو نیکیاں سمجھتے ہیں۔ مقدس داؤد نے نہایت دلچسپ لفظوں میں اس برائی سے پناہ مانگی ہے اور اس طرح پر خدا کی مناجات کی ہے۔ 'کون اپنی غلطیوں کو سمجھ سکتا ہے تو ہی مجھ کو میرے پوشیدہ عیبوں سے پاک کر۔' جو لوگ علانیہ بدی کرتے ہیں اگر ان کو بدیوں اور گناہوں سے بچانے کے لئے نصیحت کی ضرورت ہے تو وہ لوگ جو درحقیقت موت کی راہ چلتے ہیں اور اپنے تئیں نیکی اور زندگی کے راستہ پر سمجھتے ہیں کس قدر رحم کے لائق ہیں اور کتنی نصیحت کے محتاج ہیں پس میں چند قاعدے بیان کرنا چاہتا ہوں جن سے وہ بدیاں جو دل کے کونوں میں چھپی ہوتی ہیں اور جن کے چھپے رہنے سے انسان اپنے دل کا سچا حال آپ نہیں جان سکتا، معلوم ہو سکیں۔

عام قاعدہ تو اس کے لئے یہ ہے کہ ہم خود اپنے آپ کو ان مذہبی اصولوں کو جو ہماری ہدایت کے لئے مقدس کتاب اللہ میں لکھے ہیں، جانچیں اور اپنی زندگی کو اس پاک شخص کی زندگی سے مقابلہ کریں جس نے یہ فرمایا کہ اِنّا

بشرٌ مثلکم یُوحیٰ الیَّ انّما الٰھکم الٰہ وَّاحِد (رسول اللہ نے فرمایا کہ "بلاشک میں تمہاری طرح انسان ہوں پس میرے پاس وحی آتی ہے (اور تمہارے پاس نہیں آتی) اور بے شک تمہارا معبود ایک ہے) اور جو اس درجہ کمال تک پہنچا جہاں تک انسان کا پہنچنا ممکن ہے اور جس کی زندگی ہماری زندگی کے لئے نمونہ ہے اور جو اپنی پیروی کرنے والوں کے لئے بلکہ تمام دنیا کے لئے بڑا ہادی اور بہت بڑا دانا استاد ہے۔ ان دونوں قاعدوں کے برتنے میں بڑی بڑی غلطیاں پڑتی ہیں۔ کچھ تو لوگوں کی سمجھ میں غلطیاں ہوتی ہیں اور کچھ آپس میں اختلاف رائے ہوتا ہے جو بن ہوئے رہ نہیں سکتا۔ اور کچھ زمانہ کے گزرنے سے ٹھیک ٹھیک حالت اور کیفیت ان واقعات کی جو گزرے معلوم نہیں ہوسکتی۔ اس لئے برخلاف اگلے مسلمان مصنفوں کے صرف انہی قاعدوں کے بیان کرنے پر میں اکتفا نہیں کرتا بلکہ اور بھی قاعدے بیان کرتا ہوں جو انسان کو ٹھیک ٹھیک مطلوبہ راہ پر لے آتے ہیں۔

اپنے پوشیدہ عیبوں کے معلوم کرنے کا ایک عمدہ قاعدہ یہ ہے کہ ہم اس بات پر غور کریں کہ ہمارے دشمن ہم کو کیا کہتے ہیں۔ ہمارے دوست اکثر ہمارے دل کے موافق ہماری تعریف کرتے ہیں یا تو ہمارے عیب ان کو عیب ہی نہیں معلوم ہوتے اور یا ہماری خاطر کو ایسا عزیز رکھتے ہیں کہ اس کو رنجیدہ نہ کرنے کے خیال سے ان کو چھپاتے ہیں یا ایسی نرمی سے کہتے ہیں کہ ہم ان کو نہایت ہی خفیف سمجھتے ہیں۔ برخلاف اس کے دشمن ہم کو خوب ٹٹولتا ہے اور کونے کونے سے ڈھونڈھ کر ہمارے عیب نکالتا ہے۔ گو وہ دشمنی سے چھوٹی بات کو بہت بڑا کر دیتا ہے مگر اکثر اس کی کچھ نہ کچھ اصلیت ہوتی ہے۔

تا نباشد چیز کے مردم نگویند چیز ہا

(جب تھوڑی چیز ہوتی ہے تو اس کو بڑھایا جا سکتا ہے۔)

دوست ہمیشہ اپنے دوست کی نیکیوں کو بڑھاتا ہے اور دشمن عیبوں کو۔ اس لئے ہم کو اپنے دشمن کا زیادہ احسان مند ہونا چاہئے کہ ہم کو ہمارے عیبوں سے مطلع کرتا ہے۔ اگر ہم نے اس کے طعنوں کے سبب ان عیبوں کو چھوڑ دیا تو دشمن سے ہم کو وہی نتیجہ ملا جو ایک شفیق استاد سے ملنا چاہئے تھا۔

دشمن جو عیب صحیح یا غلط ہم میں لگاتا ہے ہمارے فائدہ سے خالی نہیں۔ اگر وہ ہم میں ہوتا ہے تو ہم اپنے عیب سے مطلع ہوتے ہیں اور اگر نہیں ہوتا تو خدا کا شکر کرتے ہیں کہ وہ عیب ہم میں نہیں۔ سچ ہے کہ

دشمن از دوست ناصح تر ست این جز نکوئی نہ گوید واین جز بدی نجوید

(دشمن دوست سے زیادہ ناصح ہے اس لئے کہ وہ (دوست) سوائے نیکی کے اور کچھ نہیں کہتا اور وہ (دشمن) سوائے برائی کے اور کچھ نہیں کہتا۔)

پلوٹارک کا دشمنی کے فائدوں پر جو مضمون ہے اس میں اس نے یہ بات لکھی ہے کہ دشمن جو ہم کو بدنام کرتے ہیں اس سے ہم کو ہماری برائیاں معلوم ہوتی ہیں اور ہماری گفتگو میں اور ہمارے چال چلن میں اور ہماری تحریر میں جو نقص ہیں وہ بغیر ایسے دشمن کی مدد کے کبھی معلوم نہیں ہوتے۔

علیٰ ہذا القیاس اگر ہم خود اپنے آپ کو سمجھنا چاہیں کہ ہم کیا ہیں تو ہم کو اسی بات پر غور کرنا چاہئے کہ جو لوگ ہماری تعریف کرتے ہیں اس میں سے ہم کس قدر کے مستحق ہیں اور پھر یہ سوچنا چاہئے کہ جن کاموں کے سبب سے وہ تعریف کرتے ہیں یا نہیں۔ اور پھر ہم کو یہ بھی سمجھنا چاہئے کہ وہ نیکیاں جن کے سبب ہماری تعریف کرنے والے ہماری تعریف کرتے ہیں دراصل ہم میں کہاں تک ہیں۔ ان باتوں پر انسان کو بخوبی غور کرنا نہایت ضروری ہے کیوں کہ ہمارا یہ حال ہے کہ کبھی تو ہم لوگوں کی رایوں کو جو ہماری نسبت ہیں پسند کر کے اپنے تئیں بہت بڑا سمجھنے لگتے ہیں اور کبھی ان کو ناپسند کرتے ہیں اور جو کچھ ہمارا دل کہتا ہے اس کے مقابلہ میں ان تمام رایوں کو نہیں مانتے۔

ہم کو ایسی نیکی پر بھی جس کو ہم نے اپنے خیال میں نیک سمجھا ہے مگر درحقیقت اس کی نیکی مشتبہ ہے، زیادہ اصرار نہیں کرنا چاہئے بلکہ لوگوں کی رایوں کو بھی نہایت قدر و منزلت کرنی چاہئے۔ جو ہم سے اختلاف رکھتے ہیں اور جو عقلمند اور نیک دل ہیں اور جس طرح ہم نیک دلی سے بات کہتے ہیں اسی طرح وہ بھی نیک دلی سے ہم سے مخالفت کرتے ہیں۔ مگر یہ بھی دیکھنا چاہئے کہ ان اختلاف کرنے والوں نے صرف آزادی رائے اور اس دلی نیکی سے جس کے سرچشمہ کی سوت قدرت نے ہر ایک انسان کے دل میں کھولی ہے اختلاف کیا ہے یا کسی بیرونی دباؤ یا پابندی رسم و رواج اور تعصب اور تقلید نے ان کے دل کو پھیرا ہے کیونکہ اگر یہ پچھلی بات اختلاف رائے کا سبب ہو تو وہ نہایت بے قدر ہو جاتی ہے۔

جہاں ہم کو دھوکہ کھانے کا احتمال ہے وہاں ہم کو نہایت ہوشیاری اور بہت خبرداری سے کام کرنا چاہئے۔ حد سے زیادہ سرگرمی اور تعصب اور کسی خاص فرقہ کو یا کسی خاص رائے کے لوگوں کو برا اور حقیر سمجھنا، یہ ایسی باتیں ہیں جن سے ہزاروں آفتیں پیدا ہوتی ہیں۔ وہ فی نفسہ نہایت ہی بری ہیں گو کہ وہ ہم سے کمزور دل آدمیوں کو اچھی معلوم ہوتی ہیں مگر اس پر بھی خیال رکھنا چاہئے کہ ایسے لوگ بھی دنیا میں ہیں جو دینداری اور نیکی کے لئے نہایت

مشہور ہیں مگر نہایت لغو اور نرے شیطانی اصولوں کو نیکی سمجھ کر اپنے دلوں میں اس کی جڑ گاڑ دی ہے۔ میں اس بات کو اقرار کرتا ہوں کہ میں نے آج تک کوئی ایسا عقلمند اور انصاف پسند شخص نہیں دیکھا جس میں پوری پوری یہ سب باتیں ہوں اور پھر بھی گناہ سے پاک ہو۔

اسی طرح ہم کو ان کاموں سے بھی ڈرنا چاہئے جو انسان کے کمزور دل کی قدرتی بناوٹ سے یا کسی خاص شوق سے یا کسی خاص تعلیم کے اثر سے یا کسی اور سبب سے ہوتی ہیں جس میں ہمارا دنیوی فائدہ ہے۔ ایسی حالت میں انسان کی سمجھ نہایت آسانی سے حق بات کی طرف سے پھر جاتی ہے اور اس کا دل غلطی کی طرف مائل ہو جاتا ہے۔ اور یہی باتیں ہیں جن کے سبب سے تعصب اور ہزاروں غلطیاں اور پوشیدہ برائیاں اور لامعلوم عیب انسان کے دل میں گھس جاتے ہیں جس کام کے کرنے میں عقل کے سوا اور جذبوں کی بھی ترغیب ہو اس کے کرنے میں عقلمند آدمی کو ہمیشہ ڈرنا اور ہمیشہ اس پر شبہ کرنا چاہئے کہ ضرور اس میں کوئی نہ کوئی برائی چھپی ہوئی ہوگی۔

ان اصولوں پر اپنے خیالوں کو جانچنا اور اپنے دل کو ٹٹولنا اور دل کے تاریک جذبوں کو ڈھونڈنا ہمارے لئے اس سے بڑھ کر کوئی چیز مفید نہیں ہے۔ اگر ہم اپنے دل میں ایسی مضبوط نیکی بٹھانی چاہیں جو قیامت کے دن ہمارے کام آوے۔ جس دن کہ ہمارے بھیدوں کو جاننے والا ہمارے دل کو جانچے گا جس کی عقل اور انصاف کی کچھ انتہا نہیں تو ان اصولوں پر چلنے سے بہتر ہمارے لئے کوئی راہ نہیں۔ ہمارے بانی اسلام نے جب ہم کو یہ سکھایا کہ خدا ہر جگہ حاضر و ناظر ہے ہمارے دل کے چھپے بھیدوں کو جانتا ہے تو اس نے کس خوبی اور خوبصورتی سے اس ریاکاری کی برائی ہم کو بتلادی جس سے انسان دنیا کو دھوکہ دیتا ہے اور خود اپنے آپ کو ہی فریب میں ڈالتا ہے۔ داؤدؑ نے بھی اپنی مناجات میں اس ریاکاری کے خوف کو جس سے انسان خود اپنے آپ کو دھوکہ دیتا ہے نہایت دلچسپ لفظوں میں ادا کیا ہے جہاں اس نے کہا ہے کہ —

'اے خدا مجھ کو جانچ، میرے دل کی تہہ کو ڈھونڈ، میرے خیالوں کو دیکھ، مجھ کو بخوبی پرکھ کہ مجھ میں کس برائی نے راہ کی ہے اور مجھ کو ایسی راہ پر لے چل جو ہمیشہ کو قائم رہے۔'

لفظ و معنی

رند - شرابی

بد - برا

دیندار ۔ مذہب پر عمل کرنے والا

تماش بینی ۔ تماشا دیکھنا

فریب ۔ دھوکہ

درحقیقت ۔ حقیقت میں

مقدس ۔ پاک

مناجات ۔ خدا سے منظوم دعا

پوشیدہ ۔ چھپا ہوا

ہادی ۔ ہدایت دینے والا

دانا ۔ جاننے والا، عقلمند

اکتفا ۔ قناعت

مطلع کرنا ۔ اطلاع دینا، جانکاری دینا

شفیق ۔ شفقت و محبت کرنے والا

ناصح ۔ نصیحت

نقص ۔ کمی

احتمال ۔ شک

مشتبہ ۔ شبہ سے بھرا ہوا

ABDIEL SOLUTIONS ABSOL PATNA

آپ نے پڑھا

- زیر نصاب مضمون میں سرسید احمد خاں نے ریاکاری کے صحیح مفہوم کی وضاحت کی ہے۔ عام طور پر اس عیب کا تجزیہ لوگ یوں کرتے ہیں کہ دل میں بات کچھ ہو اور ظاہر میں کچھ کہا جائے۔ لیکن ریا کا عیب اس حد تک محدود نہیں رہتا۔
- اکثر یہ ہوتا ہے کہ سمجھنے والا خود مغالطے میں رہتا ہے اور اسے یہ بھی احساس نہیں ہو پاتا کہ وہ ریاکاری کر رہا ہے۔ ریاکاری کا تعلق صرف ظاہری عمل اور ردعمل سے نہیں ہے بلکہ اکثر یہ ہوتا کہ آدمی کسے شبہے یا وہم یا غلط فہمی کی وجہ سے ایسے ایسے اقدامات کرتا ہے جس کے کرنے پر خود اسے پتہ نہیں چلتا کہ وہ صحیح کر رہا ہے یا غلط۔ ریا اسی داخلی

ذہنی پیچیدگی کا نام ہے۔ کبھی دوست غلط تعریفیں کر کے شخصیت میں ریا کا عنصر ڈال لیتے ہیں اور کبھی دشمن خوبیوں کو عیب بتا کر ذہنی تناؤ میں گرفتار کر دیتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان اپنے پورے اعتماد اور تیقن کے ساتھ اچھائیوں کو ہی انجام دے پاتا۔ کسی کی شخصیت میں ریا کے داخل ہو جانے کی وجہ سے اس کا سارا عمل بے مقصد ہو جاتا ہے اور اس کے نزدیک نیک و بد کا مسئلہ نہیں ہوتا۔

- اس نفسیاتی کشاکش کے موقع پر اگر غور کیا جائے تو انسان کے دشمن دوست کے مقابلے میں کم نقصان دہ ہوتے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ دشمن عیب جوئی کرتا ہے لیکن دوست تو شدید مغالطے میں ڈال دیتا ہے۔ وہ اپنی جھوٹی محبت یا دکھاوے کی وجہ سے ہمارے ایسے عمل کی ستائش کر جاتا ہے جو حقیقتاً لائق تحسین نہیں ہوتا۔
- سرسید احمد خاں نے اس نفسیاتی کشاکش سے بچنے اور دوست و دشمن کے الگ الگ ہتھیاروں سے محفوظ رکھنے کے لئے کچھ ایسے اصول مرتب کئے ہیں جن پر چل کر ہم وہ اطمینان حاصل کر سکتے ہیں جن سے ہماری شخصیت کی تکمیل ہو سکتی ہے۔ بہت سے جذبے ایسے ہوتے ہیں جو ہمیں عدل و انصاف برتنے کا موقع نہیں دیتے۔ تعصب حد سے بڑھی ہوئی سرگرمی اپنے اچھے کاموں کے اظہار کی بڑھی ہوئی لگن ہمارے اندر خفیہ طور پر ریاکاری کے اجزا پیدا کر لیتی ہیں۔

مختصر ترین سوالات

1. سرسید کی پیدائش کب ہوئی؟
2. سرسید کی والدہ کا نام کیا تھا؟
3. سرسید کی وفات کب ہوئی؟
4. سرسید کا کون سا مضمون آپ کے نصاب میں شامل ہے؟

مختصر سوالات

1. سرسید کی زندگی کے بارے میں پانچ جملے لکھئے۔
2. درج ذیل الفاظ کو جملوں میں اس طرح استعمال کیجئے کہ جنس ظاہر ہو جائے :
   موتی، کتاب، وقت، نام، قلم
3. مضمون کے بارے میں پانچ جملے لکھئے۔

طویل سوالات

1. سرسید کی ادبی خدمات پر ایک مضمون لکھئے۔
2. زیرِ نصاب مضمون 'ریا' کا مرکزی خیال پیش کیجئے۔

آیئے، کچھ کریں

1. سرسید کی تصنیفات کی ایک فہرست بنایئے۔
2. اپنے استاد سے سرسید کے بارے میں مزید معلومات حاصل کیجئے۔
3. اصلاحی مضامین پر کلاس میں ایک مذاکرہ کیجئے۔